احمد فراز

# احمد فرازؔ

ساحل احمد

# احمد فراز

ساحر احمد

اردو رائٹرس گلڈ، الٰہ آباد

# ضیاء فتح آبادی اور سیّد ماجد الباقری کی یاد میں



مونوگراف : احمد فراز

مرتب : ساحل احمد

اشاعت : ۱۹۹۷ء

کتابت : محمد وقار صدیقی

طباعت : کھر بندا آفسٹ ورکس، الہ آباد

تعداد : ۵۰۰

قیمت : ۱۰/-

ناشر : اردو رائٹرس گلڈ، الہ آباد

رابطہ : لٹریری بک سنٹر، ۱۲۶ چک، الہ آباد

احمد فرازؔ کی غزلیں : ۷
غزلیات : ۱۷

# احمد فرازؔ کی غزلیں

غزل کی اس نامیاتی فکر اور حیثیت کو معجّل رکھنے میں غزل گویوں نے قلمی جہاد سے کام لیا اور اسے اپنے زمانے کے مطابق آشناگیر رکھنے کی سعیٔ کی۔ اسی لیے اس کے مزاج و اجماں پر کسی تصنع یا بناوٹ کی پرچھائیں پڑتی دکھائی نہیں دیتیں۔ احمد فرازؔ نے غزل کے اسی فکری اساس کو معجّل رکھنے میں سعیٔ کی اور رومانوی حقیقت نگاری سے غزلیہ آرائش میں حصّہ لیا۔ اور اپنے زمانے کے عمرانی و معاشی تصورات سے بھی استفادہ کیا۔

احمد فرازؔ کا طرز اسلوب رومان اور نئے معاشی و تمدنی رویّوں سے مشترک ہے۔ ان کی غزلوں میں جو فکریاتی عناصر ملتے ہیں وہ اپنی نوعیت کے نئے اضافے ہیں۔ انھوں نے کلاسیکی حسن کو نئے معنوی احساس کے ساتھ ہی پیش نہیں کیا بلکہ رومان کو نفسی و ذہنی رویّہ کی پہچان کے طور پر بھی استعمال کیا ہے۔ وہ زندگی کو سرتاپا محبّت بنا دینے کا جذبہ رکھتے ہیں انھوں نے رومانوی فکر کو نیا انداز دیا۔ ان کی نیم رومانی شاعری کا ایک حصّہ ان کی اپنی تنہائی کا احساس بھی ہے جو بہت حد تک فیضؔ کی تنہائی سے مشابہ ہے۔ ان کی نگاہیں تجربات و مشاہدات سے کبھی خالی نہیں رہتیں۔ وہ حالات و مسائل کو منضبط رکھتی ہیں۔

رومان و انقلاب کے اس مشترکہ احساس نے ان کی غزلوں میں خود کلامی کی بھی کیفیت

پیدا کردی ہے۔ اور اکثر مقام پر وہ میر کی طرح سخن طراز نظر آتے ہیں۔ ان کا فن ماضی کی روایت سے اور عصر حاضر کی جدوجہد سے منسلک و مربوط ہے۔

دنیا کے حوالے سے بہت تجھ کو پکارا
اب دل کے تعلق سے ترا نام لیا جائے

اک عمر سے ہوں لذتِ گریہ سے بھی محروم
اے راحتِ جاں مجھ کو رلانے کے لیے آ

تیرے ہوتے ہوئے آجاتی تھی ساری دنیا
آج تنہا ہوں کوئی نہیں آنے والا

ترے بدن میں دھڑکنے لگا ہوں دل کی طرح
یہ اور بات کہ اب بھی تجھے سنائی نہ دوں

تمام عمر کہاں کوئی ساتھ دیتا ہے
یہ جانتا ہوں مگر تھوڑی دور ساتھ چلو

مہرباں ایسی ہو تنہائی کہ پل بھر کے لیے
چشم بستہ ہو تو یادوں کا پری خانہ کھلے

انھوں نے غزلیہ روایت کی نفی نہیں کی اور نہ فکری لمحات میں عاشقانہ گداختگی سے

گریز کیا۔ غزل کی آرائشی فکر اور لوازمات شعری کے برتاؤ کا بہ طور خاص خیال رکھا۔ شعری نزاکتوں کی نمو ریزی میں طرح طرح کے رنگوں کی اختراع کی۔ ان کی یہ اختراع سازی کلام کی معنوی تہہ داری کو بے حد وسیع بنا دیتی ہے۔

ہجر و فراق کے صدمے، عشقیہ اظہار کی متانت، ہجرت کے مسائل، شہر کے مسائل و معاملات دیرینہ رشتوں کے ٹوٹنے کا احساس اور تازگیٔ خیال کی سادہ روی ان کی غزل کے خاص زاویے ہیں جنھیں منقش و موجّل یا مطہر رکھنے میں شعر کی معنی گری کام آئی ہے۔ خاص طور پر انھوں نے وطنی اور قومی جذبات کی نقش گری میں عبودیت کی فضا تعمیر کی ہے۔

احمد فراز غزل کو ایک پوری کائنات سے متشکل کر سکتے ہیں۔ اسی لیے ان کی غزل میں حیات و کائنات کے وہ تمام نکات موجود ہیں جو ساری زندگی اور سماج سے متعلقہ رشتوں اور اس کے زمانوی پہلوؤں کو محو گیر کرنے کا اعلامیہ ہیں۔ سماجی و سیاسی فکر و انقلاب کی مصوری میں ان کا کلام بے حد توانا اور متنوع ایام کا حامل ہے۔

امیرِ شہر غریبوں کو لوٹ لیتا ہے
کبھی بہ حیلۂ مذہب، کبھی بہ نامِ وطن

جب سازِ سلاسل بجتے تھے ہم اپنے لہو سے سجتے تھے
وہ رسم ابھی تک باقی ہے یہ رسم ابھی تک جاری ہے

چلو یہ سیلِ بلا خیز ہی بنے اپنا
سفینہ اس کا، خدا اس کا، نا خدا اس

ایسی نفرت تھی کہ اس شہر کو جب آگ لگی
ہر بگولہ خس و خاشاک بہن کر نکلا

قتل گہوں کا رستہ اوروں سے کیا پوچھیں
لہو کے چھینٹوں سے اک اک فرسنگ بھرا ہے

یہ صبح کاذب تو رات سے بھی طویل تر ہے
کہ جیسے صدیاں گزر گئیں آفتاب دیکھے

احمد فراز نے اپنے اسی فنی وسیلے سے عصری معنویت کی پیچیدگی اور کج روی کو منکشف کیا ہے اور نئے و پرانے لفظیات کی مدد سے اپنی شعری دنیا کی تعمیر کی۔ وہ تراشیدہ الفاظ ہوں یا تکرار لفظی و قوافی ان سب میں معنویت کی وہ جوت جگائی ہے جو شعری اسلوب کی بازیابی میں معاون ہو سکتی ہے۔

یاروں کے ہوتے ہوئے ہم کس سے گلے مل کر روتے
کب گلیاں اپنی گلیاں تھیں، کب شہر ہمارا اس دن تھا

وہ ساعتیں ہیں عنایاتِ چشم و لب تو گئیں
وہ چاہتے ہیں حکایاتِ چشم و لب بھی نہ ہوں

عقل ہر بار دکھاتی تھی جلے ہاتھ اپنے
دل نے ہر بار کہا آگ پرائی لے لے

دست بستہ و کمر بستہ و لب بستہ بھی
اس پہ بھی خوش ہو کہ دربار میں آئے تم ہو

یہی نہیں وہ ، یہ ، چلو، ہیں ، اے ، اور، کہ ، پر ، کے استعمال میں بھی
جدّتِ ادا کی تمثال گری متوجہ کرتی ہے ۔ دو یا سہ حرفی لفظوں سے بھی معنوی صفات کی جوت
جگائی جا سکتی ہے ۔
وہ جو اشارۂ بعید ہے یا غائب کو ظاہر کرنے کی سعی ہے یا اتنا ، ایسا ، اس قدر کی پُر معنی
توضیح بھی

کیا کہیں کتنے مراسم تھے ہمارے اس سے
وہ جو اک شخص ہے منہ پھیر کے جانے والا

اب نہ وہ ہیں، نہ وہ تو ہے ، نہ وہ ماضی ہے فرازؔ
جیسے دو شخص تمنّائے سرابوں میں ملیں

وہ رات بھول چکو ، وہ سخن نہ دہراؤ
وہ رات خواب ہوئی ، وہ سخن فسانہ ہوا

اس دریا سے آگے ایک سمندر بھی ہے
اور وہ بے ساحل ہے یہ بھی دھیان میں رکھنا

یہ قریب کا اشاریہ ہے لیکن تخلیقی سطح پر وہ ہر چھپی شئے کو نہ صرف قریب کر دیتا ہے بلکہ اسے مزید موثر کر دیتا ہے۔

جانے یہ پیار سکھاتے ہیں کہ انکار فراز
ہم پہ بت خانہ و کعبہ و کلیسا نہ کھلے

یہ ایک شب کی ملاقات بھی غنیمت ہے
کسے ہے کل کی خبر تھوڑی دور ساتھ چلو

زنجیر کٹ گئی کہ کوئی دوست کٹ گیا
کچھ تو کہو یہ کیسی صدا آئی دوستو

اے حرفِ ندا، تخاطب و مراسم کا برمحل اور مثبت ذریعہ اس کا استعمال تخلیقی سطح پر کیا جائے تو اس کی بعض چھپی یا اجانی خوبیاں بھی ظاہر ہو جاتی ہیں۔ احمد فراز نے اس کو اخلاص و محبت کے پھول کھلانے اور بے لوث رشتے کو مطہّر کرنے میں استعمال کیا ہے۔

اک عمر سے ہوں لذتِ گریہ سے بھی محروم
اے راحتِ جاں مجھ کو رلانے کے لئے آ

درد کی راہیں نہیں آساں ذرا آہستہ چل
اے سبک ردائے حریفِ جاں ذرا آہستہ چل

اے رگِ جاں کے مکیں تو کبھی غور سے سن
دل کی دھڑکن ترے قدموں کی صدا لگتی ہے

کہ فارسی کا یہ مختصر سا دو حرفی کلمہ اپنے اندر معنی کی کئی دنیائیں رکھتا ہے۔ یہ دنیائیں حدِ بیان سے آگے بھی جا سکتی ہیں۔ اسی لیے کبھی کبھی کسی سبب کے لیے یا کسی خاص بیان کے لیے "کہ" کلیدِ معنی بن جاتا ہے۔ احمد فراز نے اسے عموماً شروع میں یا کسی وسیلے کے طور پر استعمال کیا ہے لیکن درمیان میں استعمال کر کے اس کے تخلیقی مدارج کو کم نہیں کیا۔

غریبِ شہر کسی سایۂ شجر میں نہ بیٹھ
کہ اپنی چھاؤں میں خود جل رہے ہیں سرو سمن

جو ابر تھا تو اسے ٹوٹ کر برسنا تھا
یہ کیا کہ آگ لگا کر ہوا روانہ وہ

یہ قرب کیا ہے کہ تو سامنے ہے اور ہمیں
شمار ابھی سے جدائی کی ساعتیں کرنی

رواں ہے ملزم خون اندرونِ شہر بھی دیکھ
کہ خوشنما تو بہت ہے فصیل باہر کی

پھر علامتِ مفعول کے طور پر جب یہ شعر میں استعمال کیا جاتا ہے تو معنی کی تہہ داری

اور بھی دو چند ہو جاتی ہے۔ بہ ظاہر یہ بہت معمولی علامت ہے مگر اس کا استعمال تخلیقیت کی سیاہی میں ڈبو کر کیا جائے تو شعر میں تفکّر کی آنچ مزید گہری ہو جاتی ہے اور کیا، کیوں، کیسے کا سوال خیال کے ارد گرد طواف کرنے لگ جاتا ہے۔ یوں علمائے ادب نے پہ کے استعمال کو متروک قرار دیا ہے مگر احمد فراز نے جہاں جہاں، جس جس موقعہ پہ اسے استعمال کیا ہے اس سے فن کا نہ کوئی در بند ہوا ہے اور نہ کراہت پیدا ہوئی ہے بلکہ اس معمولی دو حرفی لفظ سے شعر کی فکری کیفیت دو آتشہ ہو گئی ہے۔

کھائیں گے فریب ہم خوشی سے
پہ یوں کہ نہ اعتبار ٹوٹے

چراغ بجھتے ہی رہتے ہیں پر جو اب کے ہوا
اسے ہواؤں کا دیوانہ پن کہا جائے

زخموں سے بدن گلزار سہی، پہ ان کے شکستہ تیر گنو
خود ترکش والے کہہ دیں گے یہ بازی کس نے ہاری ہے

اور جو حرف ربط ہے، احرف ربط سے زیادہ مختلف نہیں۔ عموماً شعرا ءِ و کے مقابلے میں اور کا استعمال کم کرتے ہیں جب کہ احمد فراز نے بیشتر موقعوں پہ اور کا استعمال بہت خوبصورت ڈھنگ سے کیا ہے۔ کبھی کبھی اور کی تکرار زیادہ ہی مزا دے جاتی ہے۔

اور سے اور ہوئے جاتے ہیں معیارِ وفا
اب متاعِ دل و جاں بھی کوئی کیا لے جائے

اور کیا نذر کروں اے غمِ دلدار فراز
زندگی جو غمِ دنیا سے بچائی لے لے

وہ جو خوشبو بھی ہے، اور جگنو بھی ہے اور آنسو بھی ہے
جب ہوا گنگنائے گی ناچے گی جنگل اسے دیکھنا

میں کلمہ ذات، اپنی پہچان کا آئینہ، احتساب ذات کا وسیلہ۔ میں جس نے انکشافِ خودی و بے خودی کے اشاری پیکروں کے صفات کو نمو ریز کیا ہے۔ اور عصری رویہ کی آئینہ گری کی ہے۔ جس کے باعث انکی غزلوں میں عصری کرب۔ پر تفکر احتجاج اور سماجی رویے کی تمثالیں موجود ہیں۔ زندگی کے تلخ و شیریں حقائق کو اسی میں کے ذریعہ منکشف کیا گیا ہے۔

میں آپ اپنے ہی پندار کے حصار میں ہوں
بجز شکست کہاں راستہ نکلنے کا

مجھے بھی ڈھونڈ کبھی محوِ آئینہ داری
میں تیرا عکس ہوں لیکن تجھے دکھائی نہ دوں

میں اور تغافلِ غمِ دوراں کا حوصلہ
کچھ بن گیا سبب کہ مرے ساتھ تم بھی تھے

مجھ سے کیا ڈوبنے والوں کا پتہ پوچھتے ہو
میں سمندر کا حوالہ نہ کنارے کی مثال

وہ اپنے زعم میں تھا بے خبر رہا مجھ سے
اسے گمان بھی نہیں، میں نہیں رہا اس کا

احمد فراز کا یہی کمال ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے لفظوں سے بھی اپنی دنیا سجا لیتے ہیں اور انھیں لغت کے حصار سے باہر نکال کر دستِ تخلیق پر روشن کرتے چلے جاتے ہیں۔ لوگ ورنہ، آ، ہر، چلو، بھی اسی قبیل سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ جس لفظ کو جیسا اور جس شکل میں استعمال کرنا چاہتے ہیں کوئی شئے خفیہ یا جلیّہ مانع نہیں ہو سکتی۔ لفظوں پر ان کی گرفت اتنی مضبوط ہے کہ ہر لفظ ان کی فکری اطاعت پر مجبور ہے۔ وہ کبھی استعارہ یا علامت کی طرح معنی گری کا طلسم جگاتے ہیں یا زندگی کو زندگی کی طرح جینا سکھاتے ہیں۔

چلو اسی سے کہیں دل کا حال جو بھی ہو
وہ چارہ گر تو ہے اس کا خیال جو بھی ہو

آنکھوں کے طاقچوں میں جلا کر چراغِ درد
خونِ جگر کو پھر سے سپردِ قلم کریں

لوگ کیوں کرتے ہیں اب چارہ گری کے تذکرے
اب بجز حرفِ تسلّی کیا ہے غم خواراں کے پاس

ساحل احمد

مرے رسول کی نسبت تجھے اجالوں سے
میں تیرا ذکر کروں صبح کے حوالوں سے

نہ میری نعت کی محتاج ذات ہے تیری
نہ تیری مدح ہے ممکن مرے خیالوں سے

تو روشنی کا پیمبر تھا اور مری تاریخ
بھری پڑی ہے شب ظلم کی مثالوں سے

ترا پیام محبت تھا اور میرے یہاں
دل و دماغ ہیں پر نفرتوں کے جالوں سے
یہ افتخار تھا تیرا کہ میرے عرش مقام
تو ہم کلام رہا ہے زمین والوں سے
مگر یہ مفتی و واعظ یہ محتسب و فقیہہ
جو معتبر ہیں فقط مصلحت کی چالوں سے
خدا کے نام کو بیچیں مگر خدا نہ کرے
اثر پذیر ہوں خلقِ خدا کے نالوں سے
نہ میری آنکھ میں کاجل نہ مشکبو ہے لباس
کہ میرے دل کا ہے رشتہ خراب حالوں سے
ہے ترش رو مری باتوں سے صاحبِ منبر
خطیبِ شہر ہے برہم مرے سوالوں سے
مرے ضمیر نے قابیل کو نہیں بخشا
میں کیسے صلح کروں قتل کرتے والوں سے
میں بے بساط سا شاعر ہوں پر کرم تیرا
کہ باشرف ہوں قبا و کلاہ والوں سے

ابھی کچھ اور کرشمے غزل کے دیکھتے ہیں
فرازؔ اب ذرا لہجہ بدل کے دیکھتے ہیں

رہِ وفا میں حریفِ خرام، کوئی تو ہو
سو اپنے آپ سے آگے نکل کے دیکھتے ہیں

تو سامنے ہے تو پھر کیوں یقیں نہیں آتا
یہ بار بار جو آنکھوں کو مل کے دیکھتے ہیں

یہ قرب کیا ہے کہ یک جاں ہوئے نہ دور ہوئے
ہزار ایک قالب میں ڈھل کے دیکھتے ہیں

نہ تجھ کو مات ہوئی، نہ مجھ کو مات ہوئی
سو اب کے دونوں ہی چالیں بدل کے دیکھتے ہیں

ابھی تلک تو نہ کندن ہوئے، نہ راکھ ہوئے
ہم اپنی آگ میں ہر روز جل کے دیکھتے ہیں

بہت دنوں سے نہیں ہے کچھ اس کی خیر خبر
چلو فرازؔ کو، اے یار چل کے دیکھتے ہیں

سکوتِ شب ہی ستم ہو تو ہم اٹھائیں بھی
وہ یاد آئے تو چلنے لگیں ہوائیں بھی

یہ شہر میرے لیے اجنبی نہ تھا لیکن
تمہارے ساتھ بدلتی گئیں فضائیں بھی

جو بزمِ دوست سے اٹھ کر چلے بہ زعمِ تمام
کوئی پکارے تو شاید وہ لوٹ آئیں بھی

دلوں کا قرب کہیں فاصلوں سے مٹتا ہے
یہ خود فریب ترا شہر چھوڑ جائیں بھی

ہم ایسے لوگ جو آشوبِ دہر میں بھی ہیں خوش
عجب نہیں ہے اگر تجھ کو بھول جائیں بھی

سحر گزیدہ ستاروں کا نور بجھنے لگا
فرازؔ! اٹھو کہ اب اس کی گلی سے جائیں بھی

میری حالت ہے کہ احساسِ طرب ہے کوئی
تیرے بے ساختہ ہنسنے کا سبب ہے کوئی

فتنۂ گردشِ دوراں ذرا آہستہ گزر
سایۂ زلف میں آرام طلب ہے کوئی

اپنے رونے کا سبب تو نہیں معلوم مگر
لوگ کہتے ہیں کہ تقریبِ طرب ہے کوئی

آج تک ان سے رہ و رسم چلی آتی ہے
جن سے کچھ پہلے توقع تھی نہ اب ہے کوئی

یا تجھے دیکھ کے بھر آئے خوشی کے آنسو
یا مری آنکھوں میں گزری ہوئی شب ہے کوئی

جانے کن لوگوں کی بستی میں چلے آئے فراز
آب دیدہ ہے کوئی خندہ بہ لب ہے کوئی

ہم ہیں ظلمت ہیں کہ ابھرا نہیں خورشید اب کے
کوئی کرتا ہی نہیں رات کی تردید اب کے

کون سنتا تھا حدیثِ غمِ دل یوں تو مگر
ہم نے چھیڑی ہے ترے نام سے تمہید اب کے

تشنگی وجہ جنوں ہے تو چلو یوں ہی سہی
کوئی سنگ آئے سرِ ساغرِ جمشید اب کے

اک زمانے سے نہ روئے ہیں نہ جاں تڑپی ہے
دل پہ لازم ہے ترے درد کی تجدید اب کے

قصۂ اہلِ وفا جانے کہاں تک پہونچے
منزلِ دار و رسن ٹھہری ہے تمہید اب کے

لہو روئے ہیں تو گلنارِ شفق پھوٹے گی
آنسو بوئے ہیں تو ہم کاٹیں گے خورشید اب کے

ہم نے یہ سوچ کے جاں دی ہے محبت میں فرازؔ
بوالہوس کرتے ہیں کس رنگ میں تقلید اب کے

جاناں دل کا شہر، نگر افسوس کا ہے
تیرا میرا سارا سفر افسوس کا ہے

کس چاہت سے زہرِ تمنّا مانگا تھا
اور اب ہاتھوں میں ساغر افسوس کا ہے

اک دہلیز پہ جا کر دل خوش ہوتا تھا
اب تو شہر میں ہر اک در افسوس کا ہے

ہم نے عشق گناہ سے برتر جانا تھا
اور دل پر پہلا پتھّر افسوس کا ہے

قریب کے اس پیڑ کی شاخوں پر دیکھو
پھول اداسی کا ہے ثمر افسوس کا ہے

ہار کے دکھ سے پچھتاوا بڑھ کر ہے فرازؔ
دکھ کا نہیں افسوس، مگر افسوس کا ہے

ہوئی ہے شام تو آنکھوں میں بس گیا پھر تو
کہاں گیا ہے مرے شہر کے مسافر تو

مری مثال کہ اک نخلِ خشک صحرا ہوں
ترا خیال کہ شاخِ چمن کا طائر تو

میں جانتا ہوں کہ دنیا تجھے بدل دے گی
میں مانتا ہوں کہ ایسا نہیں بظاہر تو

ہنسی خوشی سے بچھڑ جا اگر بچھڑنا ہے
یہ ہر مقام پر کیا سوچتا ہے آخر تو

فضا اداس ہے، رُت مضمحل ہے میں چپ ہوں
جو ہو سکے تو چلا آ کسی کی خاطر تو

فراز تو نے اسے مشکلوں میں ڈال دیا
زمانہ صاحبِ زر اور صرف شاعر تو

اندھیرا ہے تو تہمت شام پر نئیں
وہ میرا آتشیں رخ یام پر نئیں

بہت سے ہم نوایانِ چمن نے
نظر دانے پہ رکھی دام پر نئیں

کبھی ایسی نہ تھی لیلائے فرقت
کوئی تارا قبائے شام پر نئیں

ہماری تشنگی کا حال دیکھو
نظر ساقی پہ ہے لب جام پر نئیں

محبّت زندگی بھر کا سفر ہے
کوئی منزل یہاں دو گام پر نئیں

یہ دل مائل ہے اک سادہ ادا پر
کسی مہوش کسی گل فام پر نئیں

دکانِ مے فروشاں میں مقدّم
شکستِ دل شکستِ جام پر نئیں

ہر آشنا میں کہاں خوئے محرمانہ وہ
کہ بے وفا تھا مگر دوست تھا پرانا وہ

جو ابر تھا تو اسے ٹوٹ کر برسنا تھا
یہ کیا کہ آگ لگا کر ہوا روانہ وہ

پکارتے ہیں مہ و سال منزلوں کی طرح
لگا ہے توسنِ ہستی کو تازیانہ وہ

ہمیں بھی غم طلبی کا نہیں رہا یارا
ترے بھی رنگ نہیں گردشِ زمانہ وہ

اب اپنی خواہشیں کیا کیا اسے رلاتی ہیں
یہ بات ہم نے کہی تھی مگر نہ مانا وہ

یہی کہیں گے کہ بس صورت آشنائی تھی
جو عہد ٹوٹ گیا یاد کیا دلانا وہ

اس ایک شکل میں کیا کیا نہ صورتیں دیکھیں
نگار تھا، نظر آیا نگار خانہ وہ

نظر بھی تو کرشمے بھی روز و شب کے گئے
کہ اب تلک نہیں آئے لوگ جب کے گئے

سنے گا کون تری بے وفائیوں کا گلہ
یہی ہے رسمِ زمانہ تو ہم بھی اب کے گئے

مگر کسی نے ہمیں ہم سفر نہیں جانا
یہ اور بات ہے کہ ہم ساتھ سب کے گئے

اب آئے ہو تو یہاں کیا ہے دیکھنے کے لیے
یہ شہر کب سے ہے ویراں وہ لوگ کب کے گئے

گرفتہ دل تھے، مگر حوصلہ نہ ہارا تھا
گرفتہ دل ہیں مگر حوصلے بھی اب کے گئے

تم اپنی شمعِ تمنّا کو رو رہے ہو فرازؔ
ان آندھیوں میں تو پیارے چراغ سب کے گئے

یہ کیا کہ سب سے بیاں دل کی حالتیں کرنی
فراؔز تجھ کو نہ آئیں محبتیں کرنی

یہ قرب کیا ہے کہ تو سامنے ہے اور ہمیں
شمار ابھی سے جدائی کی ساعتیں کرنی

سب اپنے اپنے قرینے سے منتظر اس کے
کسی کو شکر کسی کو شکایتیں کرنی

ہم اپنے دل سے ہیں مجبور اور لوگوں کو
ذرا سی بات پہ برپا قیامتیں کرنی

ملیں جب ان سے تو مبہم سی گفتگو کرنا
پھر اپنے آپ سے سو سو وضاحتیں کرنی

یہ لوگ کیسے مگر دشمنی نباہتے ہیں
ہمیں تو راس نہ آئیں محبتیں کرنی

کبھی فراؔز نئے موسموں میں رو دینا
کبھی تلاش پرانی رفاقتیں کرنی

یوں تو پہلے بھی ہوئے اس سے کئی بار جدا
لیکن اب کے نظر آتے ہیں کچھ آثار جدا

گر غمِ سود و زیاں ہے تو ٹھہر جا اے جاں
کہ اسی موڑ پہ یاروں سے ہوئے یار جدا

دو گھڑی اس سے رہو دور تو یوں لگتا ہے
جس طرح سایۂ دیوار سے دیوار جدا

یہ جدائی کی گھڑی ہے کہ جھڑی ساون کی
میں جدا گریہ کناں، ابر جدا یار جدا

کج کلاہوں سے کہے کون کہ اے بے خبرو!
طوق گردن سے نہیں طرۂ دستار جدا

کوئے جاناں میں بھی خاصہ تھا طرحدار فرازؔ
لیکن اس شخص کی سج دھج تھی سرِ دار جدا

سنا تو ہے کہ نگارِ بہار راہ میں ہے
سفر بخیر کہ دشمن ہزار راہ میں ہے

گزر بھی جا غمِ جان و غمِ جہاں سے کہ یہ
وہ منزلیں ہیں کہ جن کا شمار راہ میں ہے

تمیزِ رہبر و رہزن ابھی نہیں ممکن
ذرا ٹھہر کہ بلا کا غبار راہ میں ہے

گر وہ کج کلہاں کو کوئی خبر تو کرے
ابھی ہجوم سرِ راہ گزار راہ میں ہے

نہ جانے کب کا پہنچ بھی چکا سرِ منزل
وہ شخص جس کا ہمیں انتظار راہ میں ہے

فرازؔ اگرچہ کڑی ہے زمین آتشؔ کی
"ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے"

سب لوگ لیے سنگِ ملامت نکل آئے
کس شہر میں ہم اہلِ محبت نکل آئے

اب دل کی تمنا ہے تو اے کاش یہی ہو
آنسو کی جگہ آنکھ سے حسرت نکل آئے

ہر گھر کا دِیا گُل نہ کرو تم کہ نہ جانے
کس بام سے خورشیدِ قیامت نکل آئے

جو درپئے پندار ہیں ان قتل گہوں سے
جاں دے کے بھی سمجھو کہ سلامت نکل آئے

اے ہم نفسو کچھ تو کہو عہدِ ستم کی
اک حرف سے ممکن ہے حکایت نکل آئے

یارو مجھے مصلوب کرو تم کہ مرے بعد
شاید کہ تمہارا قد و قامت نکل آئے

شگفتہ دل ہیں کہ غم بھی عطا بہار کی ہے
گلِ حباب ہیں سر میں ہوا بہار کی ہے

ہجومِ جلوۂ گل پر نظر نہ رکھ کہ یہاں
جراحتوں کے چمن پر ردا بہار کی ہے

کوئی تو لالۂ خونیں کفن سے بھی پوچھے
یہ فصلِ چاکِ جگر کی ہے یا بہار کی ہے

میں تیرا نام نہ لوں پھر بھی لوگ پہچانیں
کہ آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی ہے

شمارِ زخم ابھی سے فراز کیا کرنا
ابھی تو جان مری ابتداء بہار کی ہے

برسوں کے بعد دیکھا اک "شخص دل ربا سا"
اب ذہن میں نہیں ہے پر نام تھا بھلا سا
ابرو کھچے کھچے سے آنکھیں جھکی جھکی سی
باتیں رکی رکی سی لہجہ تھکا تھکا سا
الفاظ تھے کہ جگنو آواز کے سفر میں
بن جائے جنگلوں میں جس طرح راستہ سا
خوابوں میں خواب اس کے یادوں میں یاد اس کی
نیندوں میں گھل گیا ہو جیسے رتجگا سا

پہلے بھی لوگ آئے کتنے ہی زندگی میں
وہ ہر طرح سے لیکن اوروں سے تھا جدا سا

اگلی محبتوں نے وہ نامرادیاں دیں
تازہ رفاقتوں سے دل تھا ڈرا ڈرا سا

کچھ یوں مدتوں سے ہم بھی نہیں تھے روئے
کچھ زہر میں بجھا تھا احباب کا دلاسا

پھر یوں ہوا کہ ساون آنکھوں میں آ بسے تھے
پھر یوں ہوا کہ جیسے دل بھی تھا آبلہ سا

اب سچ کہیں تو یارو ہم کو خبر نہیں تھی
بن جائے گا قیامت اک واقعہ ذرا سا

تیور تھے بے رخی کے انداز دوستی کے
وہ اجنبی تھا لیکن لگتا آشنا سا

ہم دشت تھے کہ دریا، ہم زہر تھے کہ امرت
ناحق تھا زعم ہم کو جب وہ نہیں تھا پیاسا

ہم نے بھی اس کو دیکھا کل شام اتفاقاً
اپنا بھی حال ہے اب لوگو فراز کا سا

عجب جنونِ مسافت میں گھر سے نکلا تھا
خبر نہیں ہے کہ سورج کدھر سے نکلا تھا

یہ کون پھر سے انہیں راستوں میں چھوڑ گیا
ابھی ابھی تو عذابِ سفر سے نکلا تھا

یہ تیر دل میں مگر بے سبب نہیں اترا
کوئی تو حرف لبِ چارہ گر سے نکلا تھا

یہ اب جو آگ بنا شہر شہر پھیلا ہے
یہی دھواں مرے دیوار و در سے نکلا تھا

میں رات ٹوٹ کے رویا تو چین سے سویا
کہ دل کا زہر مری چشمِ تر سے نکلا تھا

یہ اب جو سر ہیں خمیدہ کلاہ کی خاطر
یہ عیب بھی تو ہم اہلِ ہنر سے نکلا تھا

وہ قیس اب جسے مجنوں پکارتے ہیں فرازؔ
تری طرح کوئی دیوانہ گھر سے نکلا تھا

طعنہ زن تھا ہر کوئی ہم پر دلِ ناداں سمیت
ہم نے چھوڑا شہر رسوائی درِ جاناں سمیت

اس قدر افسردہ خاطر کون محفل سے گیا
ہر کسی کی آنکھ پُرنم ہے دل آزاراں سمیت

اک فقیہہِ شہر کو کیا دوش دیجے جب بھی
میکدے کے دشمنوں میں ہوں قدح خواراں سمیت

جشنِ مقتل تھا بپا اور صرف بسمل تھے ہمیں
ہم نے سوچا تھا کہ دیکھیں گے یہ دن یاراں سمیت

یہ رعونت تابکے اے دل فگاراں دیکھنا
اب گرے گا طرّۂ سلطاں سرِ سلطاں سمیت

وہ تو کیا آتے شبِ ہجراں تو کیا کٹتی فرازؔ
بجھ گئیں آخر کو سب شمعیں چراغِ جاں سمیت

تو نہ چاہے تو نہیں ہوں تو چاہے تو میں ہوں
میری اوقات ہی کیا ہے پر کاہے تو میں ہوں

تیرے غم نے مری ہستی کی ضمانت دی تھی
تو اگر اپنے تعلق کو بنا ہے تو میں ہوں

دل نے کب شیوہ دریوزہ گری ترک کیا
تیرے در پر نہ ہوا میں سرِ راہے تو میں ہوں

تو نہ مانے گا مگر خلوتِ جاں میں تیری
یار اکثر نہ سہی گاہے بہ گاہے تو میں ہوں

حیف اس فن پہ جو فنکار سے پہلے مر جائے
وقت اگر کل بھی سخن میرے سراہے تو میں ہوں

اور کیا چاہیے اس فقر و فقیری میں فرازؔ
صاحبِ فرقہ و پیوند کلاہے تو میں ہوں

شعر کسی کے ہجر میں کہنا حرفِ وصال کسی سے
ہم بھی کیا ہیں دھیان کسی کا اور سوال کسی سے

ساری متاعِ ہستی اپنی خواب و خیال تو ہیں
وہ بھی خواب کسی سے مانگے اور خیال کسی سے

ایسے سادہ دل لوگوں کی چارہ گری کیسے ہو
درد کا درماں اور کوئی ہو کہنا حال کسی سے

دیکھو اک صورت نے دل میں کیسی جوت جگائی
کیسا سجا سجا ہے شہرِ ملال کسی سے

تم کو زعم فرازؔ اگر ہے تم بھی جتن کر دیکھو
آج تلک تو ٹوٹ نہ پایا درد کا حال کسی سے

رت جگے ہوں کہ بھرپور نیندیں مسلسل اسے دیکھنا
وہ جو آنکھوں میں ہے اور آنکھوں سے اوجھل اسے دیکھنا

وہ جو خوش بو بھی ہے اور جگنو بھی ہے اور آنسو بھی ہے
جب ہوا گنگنائے گی ناچے گا جنگل اسے دیکھنا

جو ہواؤں میں ہے اور فضاؤں میں ہے اور دعاؤں میں بھی
کوئی پھیلائے دامن کہ لہرائے آنچل اسے دیکھنا

شاعری میں بھی اس جانِ جاں کا سراپا سماتا نہیں
اور آنکھوں کی دیرینہ خواہش مکمّل اسے دیکھنا

شامِ وعدہ سہی دکھ زیادہ سہی پھر بھی دیکھو فرازؔ
آج شب اس فرقت میں کہہ لو غزل کل اسے دیکھنا

شگفتِ گل کی صدائیں رنگِ چمن میں آؤ
کوئی بھی رت ہو بہار کے پیرہن میں آؤ

کوئی سفر ہو تمہیں کو منزل سمجھ کے جاؤں
کوئی مسافت ہو تم مری ہی لگن میں آؤ

کبھی تو ایسا بھی ہو کہ لوگوں کی بات سن کر
میری طرف تم رقابتوں کی جلن میں آؤ

وہ جس غرور و ناز سے تم چلے گئے تھے
کبھی اسی تمکنت سی بانکپن میں آؤ

یہ کیوں ہمیشہ مری طلب ہی تمہیں صدا دے
کبھی تو خود بھی سپردگی کی تھکن میں آؤ

ہم اہلِ دل ہیں ہماری اقلیم حرف کی ہے
کبھی تو جانِ سخن، دیارِ سخن میں آؤ

کبھی کبھی وادیوں سے کوئی پکارتا ہے
فرازؔ جانی فراز پیارے وطن میں آؤ

سنا ہے لوگ اسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں
سو اس کے شہر میں کچھ دن ٹھہر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے درد کی گاہک ہے چشم ناز اس کی
سو ہم بھی اس کی گلی سے گزر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے بولے تو باتوں سے پھول جھڑتے ہیں
یہ بات ہے تو چلو بات کر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے دن کو اسے تتلیاں ستاتی ہیں

سنا ہے رات کو جگنو ٹھہر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے حشر ہیں اس کی غزال سی آنکھیں

سنا ہے اس کو ہرن دشت بھر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے آئینہ تمثال ہے جبیں اس کی

جو سادہ دل ہیں اسے بن سنور کے دیکھتے ہیں

بس اک نگاہ میں لٹتا ہے قافلہ دل کا

سو رہ روانِ تمنا بھی ڈر کے دیکھتے ہیں

کسے نصیب کہ بے پیرہن اسے دیکھے

کبھی کبھی در و دیوار گھر کے دیکھتے ہیں

رکے تو گردشیں اس کا طواف کرتی ہیں

چلے تو اس کو زمانے ٹھہر کے دیکھتے ہیں

کہانیاں ہی سہی سب مبالغے ہی سہی

اگر وہ خواب ہے تعبیر کر کے دیکھتے ہیں

اب اس کے شہر میں ٹھہریں کہ کوچ کر جائیں

فراز آؤ ستارے سفر کے دیکھتے ہیں

ردائے زخم ہر گُلِ پیرہن پہنے ہوئے ہے
جسے دیکھو وہی چُپ کا کفن پہنے ہوئے ہے

وہی سچ بولنے والا ہمارا دوست دیکھو
گلے میں طوق پاؤں میں رسن پہنے ہوئے ہے

اندھیری اور اکیلی رات اور دل اور یادیں
یہ جنگل جگنوؤں کا پیرہن پہنے ہوئے ہے

رہا ہو بھی چکے سب ہم قفس کب کے مگر دل
یہ وحشی اب بھی زنجیرِ کہن پہنے ہوئے ہے

سنا ہے ایک ایسا طائفہ ہے اہلِ دل کا
جو دیوانہ نہیں دیوانہ پن پہنے ہوئے ہے

فرازؔ اس شہر میں کس کو دکھاؤں زخم اپنے
یہاں تو ہر کوئی مجھ سا بدن پہنے ہوئے ہے

جہاں بھی جانا تو آنکھوں میں خواب بھر لانا
یہ کیا کہ دل کو ہمیشہ اداس کر لانا

میں برف برف رتوں میں چلا تو اس نے کہا
پلٹ کے آنا تو کشتی میں دھوپ بھر لانا

بھلی لگی ہمیں خوش قامتی کسی کی مگر
نصیب میں کہاں اس سروِ کا ثمر لانا

پیام کیسا مگر ہو سکے تو اے قاصد
کبھی کوئی خبرِ یارِ بے خبر لانا

فراز اب کے جب آؤ دیارِ جاناں میں
بجائے تحفۂ دل ارمغانِ سر لانا

اس نے سکوتِ شب میں بھی اپنا پیام رکھ دیا
ہجر کی رات بام پر ماہِ تمام رکھ دیا
آمدِ دوست کی نوید کوئے وفا میں عام تھی
میں نے بھی اک چراغ سا دل سرِ شام رکھ دیا
شدّتِ میکشی میں بھی غیرتِ میکشی رہی
اس نے جو پھیری نظر، میں نے بھی جام رکھ دیا
دیکھو یہ مرے خواب تھے، دیکھو یہ میرے زخم ہیں
میں نے تو سب حسابِ جاں، برسرِ عام رکھ دیا
اس نے نظر نظر میں ہی ایسے بھلے سخن کہے
میں نے تو اس کے پاؤں میں سارا کلام رکھ دیا
اور فرازؔ چاہئیں کتنی محبتیں تجھے
ماؤں نے تیرے نام پر بچوں کا نام رکھ دیا

رنجش ہی سہی دل ہی دکھانے کے لیے آ
آ پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لیے آ

کچھ تو مرے پندارِ محبّت کا بھرم رکھ
تو بھی تو کبھی مجھ کو منانے کے لیے آ

پہلے سے مراسم نہ سہی پھر بھی کبھی تو
رسم و رہِ دنیا ہی نبھانے کے لیے آ

کس کس کو بتائیں گے جدائی کا سبب
تو مجھ سے خفا ہے تو زمانے کے لیے آ

اک عمر سے ہوں لذّتِ گریہ سے بھی محروم
اے راحتِ جاں مجھ کو رلانے کے لیے آ

اب تک دلِ خوش فہم کو تجھ سے ہیں امیدیں
یہ آخری شمعیں بھی بجھانے کے لیے آ

قربتوں میں بھی جدائی کے زمانے مانگے
دل وہ بے مہر کہ رونے کے بہانے مانگے

ہم نہ ہوتے تو کسی اور کے چرچے ہوتے
خلقتِ شہر تو کہنے کو فسانے مانگے

یہی دل تھا کہ ترستا تھا مراسم کے لیے
اب یہی ترکِ تعلق کے بہانے مانگے

اپنا یہ حال کہ جی ہار چکے لُٹ بھی چکے
اور محبت وہی انداز پرانے مانگے

زندگی ہم ترے داغوں سے رہے شرمندہ
اور تو ہے کہ سدا آئینہ خانے مانگے

دل کسی حال پہ قانع ہی نہیں جانِ فرازؔ
مل گئے تم بھی تو کیا اور نہ جانے مانگے

پیام آئے ہیں اس یارِ بے وفا کے مجھے
جسے قرار نہ آیا کہیں بھلا کے مجھے

جدائیاں ہوں تو ایسی کہ عمر بھر نہ ملیں
فریب دو تو ذرا سلسلے بڑھا کے مجھے

نشے سے کم تو نہیں یادِ یار کا عالم
کہ لے اڑا ہے کوئی دوش پہ ہوا کے مجھے

میں خود کو بھول چکا تھا مگر جہاں والے
اداس چھوڑ گئے آئینہ دکھا کے مجھے

تمہارے بام سے اب کم نہیں ہے رفعتِ دار
جو دیکھنا ہو تو دیکھو نظر اٹھا کے مجھے

کھنچی ہوئی ہے مرے آنسوؤں میں اک تصویر
فرازؔ دیکھ رہا ہے وہ مسکرا کے مجھے

# احمد فراز

خاندانی نام سید احمد شاہ
سید محمد شاہ برق ۱۴ر جنوری ۱
کو نوشہرہ میں پیدا ہوئے۔ تعل
مدارج اسلامیہ ہائی اسکول کو
ایڈورڈ کالج پشاور اور پشا
یونیورسٹی سے طے کیے۔ اردو ا
فارسی دونوں زبانوں میں ۔ا
کی سند حاصل کی۔ ملازم

ابتدا ریڈیو پاکستان میں ایک پروڈیوسر کی حیثیت سے کی۔ اسلامیہ
و تدریس کا فریضہ انجام دیا۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن کے سربرا
تنہا تنہا، دردِ آشوب، نایافت، جاناں جاناں، شب خون، میرے
خواب ریزہ ریزہ، بے آواز گلی کوچوں میں، نابینا شہر میں آئینہ، پس ان
موسم (شاعری) موم کا پتھر (منظوم ڈرامہ) اور سب آوازیں میری ہیں (منظ
ترجمہ) متعدد تصانیف ہیں۔ ملک اور بیرون ملک کے کئی اہم اعزاز
حاصل کیے۔